© rasailojaraid.com

ملک غلام علیؒ کی یاد میں

(۱)

قاضی حسین احمد

ملک غلام علی صاحبؒ مولانا مودودیؒ کے شاگرد رشید تھے۔ آپ اسلامیہ کالج لاہور کے زمانۂ طالب علمی سے مولانا مودودی کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ مولانا مودودی کی شخصیت ہمہ پہلو تھی۔ وہ علمی انہماک کے ساتھ ساتھ عملی سیاسی میدان میں اسلامی انقلاب کے داعی تھے۔ ایک دینی اور سیاسی جماعت کے بانی اور رہنما کے طور پر بھی اپنی جماعت کی نگرانی بھی کرتے تھے، اور عالمی اسلامی تحریک کے قائد کی حیثیت سے پوری دنیا کی اسلامی تحریکیں بھی ان کی طرف رہنمائی کے لیے دیکھتی تھیں۔ ملک صاحب نے مولانا مودودی کی فکر، ان کی سیاسی حکمت عملی اور ان کے فہم کو پوری طرح جذب کیا، لیکن اپنے لیے علمی اور فکری میدان کو منتخب کیا اور اس کام میں مولانا کے معاونِ خصوصی بن گئے۔ ملک صاحب نے اپنے فرضِ منصبی کو اس خوبی سے نبھایا کہ ملک صاحبؒ اور مولانا مودودیؒ کے اسلوب اور ان کے طرزِ تحریر میں بھی فرق کرنا مشکل تھا۔ مولانا مودودیؒ کے پائے کی علمی شخصیت اگر کسی کو یہ کہہ دے: ملک صاحب! دکھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ آپ میری طرف سے لکھ کر بھیج دیا کریں، تو اعتماد کی اس سے بڑی سند اور کیا ہو سکتی ہے۔

ملک غلام علیؒ کی طبیعت میں شگفتگی اور لطیف مزاح کی چاشنی تھی جس نے ان کے عاجزانہ انکسار کے ساتھ مل کر ان کی شخصیت کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔

میں ۱۹۷۱ء میں افغانستان کے مشہور اسلامی صحافی منہاج الدین گہیز کو لے کر لاہور آیا۔ ان دنوں مولانا صاحبؒ صاحبِ فراش تھے۔ بیماری اور ضعف کی حالت میں چارپائی پر لیٹے لیٹے انھوں نے منہاج الدین گہیز شہید سے مختصر ملاقات کی۔ گہیز شہید نے مولانا کی صحت کے پیشِ نظر ان کے ساتھ طویل بات چیت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور طے ہوا کہ علمی مسائل میں ملک غلام علی صاحب کی رہنمائی حاصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی جائے۔ کمیز صاحب سے ملک صاحب کی طویل علمی گفتگو میں، میں بھی شریک رہا۔ یہ گفتگو ایک جدید اسلامی ریاست میں سیاسی نظام اور خواتین کے دائرہ کار سے متعلق تھی۔ اس ملاقات میں مجھے اندازہ ہوا کہ علمی مسائل میں ملک صاحب "مولانا مودودیؒ" کے موقف کی پوری پیروی کرتے ہیں۔ اور اپنے فاضل استاد کے موقف کے حق میں دلائل و براہین سے مسلح ہیں۔

عمر کے آخری حصے میں ملک غلام علی صاحب کے جوان سال بیٹے ملک انعام اللہ، کابل کے شمال میں پروان کے محاذ پر شہید ہو گئے (۱۷ اگست ۱۹۸۹)۔ یہ افغانستان میں سوویت افواج کی مداخلت کا آخری سال تھا۔ ملک صاحب کے پاس میں تعزیت کے لیے گیا تو انھوں نے سعادت مند بیٹے کے بارے میں بتایا کہ تقریباً پانچ سال سے جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف تھا۔ ملک صاحب کی بیماری کی اطلاع پر لاہور آیا اور ایک ماہ تک والد صاحب کی خدمت میں رہا۔ جب ملک صاحب صحت یاب ہو کر ہسپتال سے گھر واپس آگئے تو پھر والد محترم کی خدمت میں عرض کی: اب مجھے اپنے کام پر جانے کی اجازت دیجیے۔ والدین کو معلوم ہے کہ خود جہاد پر جانے کی نسبت اولاد کو خندہ پیشانی سے جہاد پر رخصت کرنا اور ان کی شہادت کی خبر کو خندہ پیشانی سے سننا اولیاء اللہ کا کام ہے۔ ملک غلام علی صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ دونوں اس بڑی آزمائش میں کامیاب رہے۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو قابل رشک ہے اور اس میدان میں ان کے رفقا میں سے ان کے ہم پلہ کم ہی ہیں۔

اپنی اہلیہ کے سامنے جب میں ملک غلام علی صاحب کے صبرو استقامت، ان کی طبیعت کی نرمی اور شیرینی کے پہلو کا ذکر کرتا ہوں تو وہ بتاتی ہیں کہ ملک صاحب کی اہلیہ محترمہ بھی اس لحاظ سے ملک غلام علی صاحب کی شخصیت ہی کا پرتو نظر آتی ہیں۔ یہ سعادت کم ہی لوگوں کو نصیب ہوئی ہے کہ اہل و عیال بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں۔ یہ راہِ خدا میں ملک صاحب کے اخلاص اور للہیت کی برکت تھی کہ ان کا پورا ماحول اس رنگ میں رچا بسا تھا۔

ملک غلام علی صاحب آخری وقت تک سمع و اطاعت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز رہے۔ جماعت کی قیادت کی ذمہ داری ہم جیسے کم مایہ لوگوں پر آپڑی۔ یہ بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے کہ کسی کو اپنے سے کم تر آدمی کی اطاعت کرنی پڑے۔ میں عمر تجربے اور علم و فہم کے لحاظ سے ان کے ہم پلہ نہیں تھا، لیکن محض امیر جماعت کے منصب کی وجہ سے انھوں نے مجھے اپنا مکمل تعاون پیش کیا۔ وہ آخر وقت تک جماعت اور امیر جماعت کے ساتھ رہے۔

ملک صاحب نے جوانی کے عالم میں اسلام کو سمجھا۔ اسے دل و جان سے اپنا طریقِ زندگی بنایا۔ زندگی کے آخری لمحے تک دین کی سربلندی کے لیے ایک نظام کی جکڑ بندیوں کو قبول کیا۔ اس نظام کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اندر اپنی صلاحیتیں اقامت دین کی جدوجہد کے لیے وقف کیں اور کامل اطاعت و وفاداری کی حالت میں اپنی جان، جانِ آفرین کے سپرد کی۔ ان کی زندگی اس ارشادِ ربانی کے مطابق تھی:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (اللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ وَاجْعَلْہُ مِنْ وَّرَثَۃِ جَنَّۃِ النَّعِیْم)

(۲)

میاں طفیل محمد

مولانا ملک غلام علی صاحب سے میرا تعارف اپریل ۱۹۴۴ میں اس وقت ہوا جب میں وکالت کے بعد ٹھیکیداری، اور ٹھیکیداری کے بعد اپنے ایک رفیق چوہدری محمد انور کے ساتھ شراکت چھوڑ کر مستقل طور پر جماعت کے ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے، نواں کوٹ لاہور سے دارالاسلام پٹھان کوٹ گیا۔ اس سے پہلے میں ملک صاحب اور مرکزِ جماعت کے کسی بھی آدمی کو، سوائے مولانا مودودی صاحب کے، نہیں جانتا تھا۔ دارالاسلام میں مجھے جو رہائشی کوارٹر ملا اس کے ایک طرف ملک غلام علی صاحب، اور دوسری طرف مولانا مودودی صاحب کی والدہ محترمہ، جن کو ہم سب دادی اماں کہتے تھے، رہتی تھیں۔ ملک غلام علی صاحب سے اگلے کوارٹر میں نعیم صدیقی صاحب رہتے تھے۔

ملک غلام علی صاحب کے ابتدائی حالات، جو میرے علم میں آئے ہیں وہ، یہ ہیں کہ وہ سون سکیسر ضلع خوشاب کے ایک باا‌ثر معزز اعوان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی۔ پھر وہ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ لاہور میں آ گئے جہاں انھیں مولانا علم الدین سالک جیسے اساتذہ کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ سالک صاحب نے ملک صاحب کی سنجیدہ اور متین و ذہین طبع کے پیش نظر ان پر خاص توجہ دی اور ان کے ذہن و اخلاق کو سنوارا اور جلا دی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخل ہو گئے۔ وہاں وہ تھرڈ یا فورتھ ایئر میں پڑھتے تھے کہ مولانا مودودی صاحب اسلامیہ کالج میں دینیات کے اعزازی لیکچرر مقرر ہوئے۔ مولانا مودودی صاحب کے ان لیکچروں سے، ملک صاحب اور ان کے متعدد ساتھی، اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی کایا ہی پلٹ گئی۔ شیخ فقیر حسین مرحوم اور چوہدری غلام جیلانی مرحوم (مدیر و مالک ہفت روزہ ایشیا) بھی مولانا مودودی صاحب کی انھی دنوں کی فتوحات میں سے تھے۔ مولانا مودودی صاحب کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان لیکچروں کا شہرہ لاہور کے دوسرے کالجوں میں ہوا تو دوسرے کالجوں کے طلب بھی یہ لیکچر سننے کے لیے آنے لگے۔ چنانچہ کالج کی انتظامیہ نے مولانا کے لیکچر کا انتظام کلاس روم کے بجائے اسلامیہ کالج کے حبیبہ ہال میں شروع کر دیا۔ پنجاب کے انگریز گورنر نے مولانا مودودی صاحب کے تصورِ دین و دینیات سے لاہور کے کالجوں کے طلب کو متاثر ہوتے دیکھا تو اس نے وزیرِ اعظم پنجاب سکندر حیات خاں کے ذریعہ انجمن حمایت اسلام کے ذمہ داروں پر دباؤ ڈالا کہ وہ مودودی صاحب کا کوئی علاج اور اس صورت حال کا تدارک کریں، جس سے انجمن اور اسلامیہ کالج لاہور کے ذمہ دار سخت پریشان ہو گئے۔ مولانا مودودی صاحب تو یہ خدمت، محض فی اللہ، خدمتِ دین کے طور پر ہی کر رہے تھے، ان کا کوئی ذاتی مفاد تو اس سے وابستہ نہیں تھا۔ اس لیے مولانا مرحوم نے انجمن اور کالج کی انتظامیہ کو پریشان دیکھ کر خود ہی دینیات کی لیکچرر شپ سے استعفیٰ دیا اور ان کی پریشانی کو دور فرما دیا۔ اسلامیہ کالج سے مولانا مودودی صاحب کی علیحدگی کے بعد ملک غلام علی صاحب بھی اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر مولانا کے ساتھ ان کے ہاں آ گئے، اس لیے کہ مولانا مودودی صاحب کے نزدیک انگریز کی تعلیم گاہیں مسلمان نوجوانوں کے لیے تعلیم و تربیت کے ادارے نہیں بلکہ قتل گاہیں تھیں، جہاں ان کو اپنے دین و ثقافت اور ذوق و کردار سب سے بیگانہ و باغی بنانے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ افسوس ہے کہ یہ ادارے آزادی اور قیام پاکستان کے بعد اصلاحِ احوال کے بجائے سوگنا بدتر مذبحوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

لاہور میں مولانا مودودی صاحب کے ہاں ملک صاحب کے لیے کوئی کام اور گنجایش نہ ہونے کی وجہ سے ملک صاحب کو جالندھر میں سید عبدالعزیز شرقی صاحب کے ہاں بھیج دیا گیا، جو غالباً وہاں پریس چلاتے تھے۔ سید عبدالعزیز شرقی صاحب ان چار حضرات میں سے ایک تھے، جنھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی طرف سے اپنے ہم خیال ساتھیوں کے لیے پہلی پکار پر لبیک کہا تھا۔

جون ۱۹۴۲ میں دوسری جنگ عظیم کے دوران جب جاپان کی افواج انڈونیشیا اور سنگاپور وغیرہ کو روندتی ہوئی برما کی مشرقی پاکستان سے ملحق سرحد تک پہنچ گئیں، اور انھوں نے انگریزوں کا، فخرِ برطانیہ کوئین الزبتھ نامی سب سے بڑا جہاز خلیج بنگال میں ڈبو دیا، تو انگریز کو ہندوستان کی بھی فکر لاحق ہو گئی۔ حکومتِ ہند نے بڑے شہروں سے غیر ضروری آبادی کو مضافات میں منتقل ہو جانے کی ہدایت کی، تو مولانا مودودی صاحب بھی اپنے ادارہ ترجمان القرآن اور جماعت اسلامی کے مرکز کے ساتھ اسلامیہ پارک پونچھ روڈ لاہور سے دارالاسلام پٹھان کوٹ چلے گئے۔ ملک غلام علی صاحب بتاتے تھے کہ دارالاسلام پٹھان کوٹ منتقل ہونے کے بعد مولانا مودودی صاحب نے انھیں جالندھر سے دارالاسلام بلا کر مکتبہ ترجمان القرآن ان کے سپرد کر دیا۔ اور پھر وہ قیام پاکستان کے بعد، مرکزِ جماعت اور رسالہ ترجمان القرآن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے دفاتر ۳۰ / ۳۱ اگست ۱۹۴۷ کو لاہور منتقل ہونے تک اسی کام پر مامور رہے، اور اپنے فارغ اوقات میں عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں اپنی استعداد بڑھاتے رہے اور مطالعہ میں مولانا کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔

لاہور آنے کے بعد اچھرہ میں جماعت اسلامی اور رسالہ ترجمان القرآن کے دفاتر قائم ہوئے۔ اب مولانا مودودی صاحب جماعتِ اسلامی ہند کے امیر کے بجائے صرف امیرِ جماعتِ اسلامی پاکستان رہ گئے تھے۔ ہندوستان کی جماعتِ اسلامی ہم سے الگ ہو کر جماعتِ اسلامی ہند یا بھارت بن گئی تھی، اور اس نے مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب کو اپنا امیر بنا لیا۔ دارالاسلام پٹھان کوٹ سے پاکستان آنے کے بعد مولانا مودودی صاحب نے ملک غلام علی صاحب کو مکتبہ سے نکال کر اپنا خصوصی معاون بنا لیا۔ اس وقت سے مولانا مرحوم کے آخری لمحۂ حیات تک ملک صاحب اسی منصب پر فائز رہے۔ اس طرح سے میں اور ملک غلام علی صاحب اپریل ۱۹۴۴ سے ملک صاحب کے آخری یوم حیات تک دارالاسلام، اچھرہ اور منصورہ میں یکجا اور اکٹھے جماعت اسلامی کے ہمہ وقتی کارکن چلے آئے ہیں۔ اس درمیان میں ۱۹۸۱ سے ۱۹۸۴ تک ملک صاحب پاکستان کی شریعت کورٹ کے جج کی حیثیت سے اسلام آباد میں رہے۔ ان چار سالوں کے سوا اور کوئی وقفہ ہماری رفاقت میں نہیں آیا۔

مولانا ملک غلام علی صاحب نے بھی مولانا مودودیؒ کی طرح کسی یونیورسٹی یا دارالعلوم سے رسماً علم حاصل نہیں کیا۔ مولانا موصوف کی محبت و رفاقت اور اپنی ذاتی محنت و کوشش اور ریاضت سے علم حاصل کیا اور وہ علم و فضل اور فقاہت کے بلند ترین مرتبہ پر جا پہنچے۔ اس سلسلے میں ان کے علم و فقاہت کا اندازہ ان کے شریعت کورٹ پاکستان کے جج کی حیثیت سے صادر کردہ فیصلوں، رسائل و مسائل جلد ششم اور ہفتم، اور خلافت و ملوکیت پر اعتراضات کا علمی جائزہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ علم و تقویٰ کے میدان میں، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے علاوہ، مولانا مودودیؒ کا ہم پلہ اگر کوئی شخص تھا، تو وہ ملک غلام علی مرحوم ہی تھے اور میرے نزدیک تو مولانا مودودی کا علم و فضل ملک صاحب کے ساتھ دفن ہو گیا ہے۔ اب اس پائے کا صاحبِ علم کوئی شخص ہمارے درمیان نہیں رہا ہے۔ اللہ رب العالمین ہی کی ذات پاک ہے کہ وہ اس خلا کو پُر کرنے کی کسی کو توفیق عطا فرما دے وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

جماعتِ اسلامی کی صفوں میں جو چند حضرات، صحابہ کا نمونہ اور ان کے نقشِ پا تھے، ان میں ملک غلام علی مرحوم گلِ سر سبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ملک غلام علی صاحب کی عالمانہ ذمہ داری اور دیانت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی زندگی کے آخری آٹھ دس سالوں میں ملک صاحب ہی مولانا کے نام آنے والے سوالات، استفسارات و مسائل کے جوابات تحریر فرماتے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کو مولانا مرحوم کے سامنے پیش کرتے۔ ان میں مولانا جن جوابات میں کوئی اصلاح و تبدیلی یا رد و بدل فرماتے ان سب کو تو ملک صاحب نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے منسوب اور ان کے نام سے شائع کیا ہے اور جن کو یہ جنم رہنے دیا اور یا جن کا جواب ملک صاحب نے مولانا مرحوم کے بعد خود ہی دیا ہے، ان سب کو اپنے نام سے شائع کیا۔ اس طرح سے ملک غلام علی صاحب کے غیر مطبوعہ رسائل و مسائل کی ایک دو جلدیں اور مرتب ہو کر شائع ہوں گی' ان شاء اللہ۔

ملک غلام علی صاحب اپنے ذاتی اوصاف کے لحاظ سے انتہائی منکسر المزاج، سراپا اخلاص و تواضع، کم سخن، خلق محمدی کے آئینہ دار اور اپنی ہی سوچوں میں غرق رہنے والے تھے۔ میری پچاس سالہ رفاقت کے دوران، میں نے کبھی ان کو کسی سے لڑتے جھگڑتے تو درکنار بلند آواز سے کلام کرتے بھی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا۔ کبھی کسی دوسرے کے کام میں دراندازی یا مداخلت نہیں کی۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں منہمک رہے۔ جو کام بھی مولانا مرحوم یا جماعت نے ان کے سپرد کیا اسے پورے انہماک سے انجام دینے میں لگ گئے یا پھر اپنے مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انھوں نے کبھی کسی معاملے میں مولانا مودودی صاحب یا مجھ سے اختلاف کیا، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔

(۳)

خلیل احمد حامدی

ملک غلام علی مرحوم، جن کا انتقال ۲۶ ستمبر ۱۹۹۴ء کو منصورہ میں ہو گیا ہے، مولانا مودودیؒ کے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے۔ موصوف ۱۹۲۰ میں سون سکیسر میں پیدا ہوئے۔ یہ خالصتاً دیہاتی معاشرہ تھا، جہاں علم و تہذیب کے افق تو محدود ہوتے ہیں، مگر کچھ ایسی خوبیاں بھی اس میں پائی جاتی ہیں جو آیندہ چل کر تہذیب و علم کے لیے اچھی بنیاد ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً طبیعت میں سادگی، قناعت، احترام باہمی، اہل علم کا اکرام اور دین کی اساسی اقدار کے ساتھ محبت و وابستگی۔ ملک صاحب ان تمام محاسن کو جلو میں لیے شہر میں داخل ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات خود ان کی زبان سے سن لیں:

"میرا تعلق ایک دینی گھرانے سے تھا۔ میرے والد بہت دیندار تھے۔ تہجد گزار تھے، وہ اپنی حد تک نماز، روزہ اور نیکی کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ یہ ان کی عادت تھی۔ مجھے بچپن ہی سے تعلیم کا بہت شوق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا، اور میں سکول میں اچھے طلبہ میں شمار ہوتا تھا۔ پرائمری سے آگے تک ہر جماعت میں اچھے نتیجے کی بنا پر مجھے وظیفہ ملتا رہا۔ گاؤں کے بزرگ بتاتے تھے کہ گاؤں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی طالب علم کو وظیفہ ملا ہو۔" (قومی ڈائجسٹ، جنوری ۱۹۸۰)

والدین کی ابتدائی تربیت انسان کی فطرت پر گہرے نقوش مرتسم کر دیتی ہے۔ ملک صاحب کے اندر اس تربیت کے آثار و معالم ملنے والوں کو پہلی ملاقات میں نظر آجاتے تھے۔ علی الخصوص دو باتیں: سادگی اور تدین۔ یہ دونوں باتیں انسانی سیرت کے اعلیٰ ترین جوہر سمجھی جاتی ہیں، اور جس انسان کے مقدر میں علم و دعوت کی وادیوں میں مراحل شوق طے کرنا لکھا ہو وہ ان جواہر کے بغیر یہ مراحل عبور نہیں کر سکتا۔

لاہور میں آمد

دیہاتی زندگی کی ان خوبیوں کو لیے ہوئے ملک صاحب شہر کی فضا میں آ گئے۔ فرماتے ہیں:

"ہمارے علاقے میں نوشہرہ مرکزی قصبہ ہے۔ جہاں تھانہ، سول ہسپتال اور ہائی سکول ہے۔ میں اسی سکول میں تعلیم پا رہا تھا۔ تعلیم کا انتظام اور معیار وہاں اچھا نہ تھا۔ میرے ایک بڑے شفیق استاد تھے جو وہاں پڑھاتے تھے، لاہور کے رہنے والے تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ اگر کوئی ایسی صورت بن جائے کہ لاہور جا کر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکوں تو بہت مناسب ہو گا۔ انہوں نے بھی میری تجویز پسند فرمائی، ان کا نام مولانا عبدالغفور تھا۔ حویلی کابلی مل میں ان کا مکان تھا۔ بہت نیک اور دیندار تھے۔ بی۔ اے، بی۔ ایڈ تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں ان شاء اللہ تمہارا انتظام کرا دوں گا۔ چنانچہ شیرانوالہ اسلامیہ ہائی سکول میں جو انجمن حمایت اسلام کے زیر اہتمام چل رہا تھا انہوں نے مجھے داخل کرا دیا، اور سکول کا سب سے اچھا جو سیکشن تھا، وہ مجھے دلوایا"۔ (ایضاً)

یوں ملک صاحب یکایک سون سکیسر کی سادہ و محدود فضاؤں سے نکل کر لاہور جیسے شہر میں اوائل عمر میں ہی آ گئے۔ اس نئے ماحول میں ہر چیز ان کے لیے نئی ہو گی، تعلیم کے میدان میں باہم مسابقت ہو رہی ہو گی، ملکی اور غیر ملکی مسائل پر سیاسی بحثیں ہوتی ہوں گی۔ مظاہر تمدن نئے نئے پیکر میں سامنے آ رہے ہوں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت شامل حال نہ ہو تو یہ چیزیں انسان کو راہِ راست سے منحرف بھی کر سکتی ہیں، مگر ملک صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی اپنی سابقہ اچھائیاں محفوظ رکھنے اور ان اچھائیوں میں مزید ترقی کرنے کے مواقع فراہم کر دیے۔ فرماتے ہیں: "شیرانوالہ اسلامیہ ہائی سکول میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ طریق کار یہ تھا کہ جب نماز کا وقت ہوتا، تو تمام اساتذہ اپنے اپنے طالب علموں کو ساتھ لے کر مسجد میں خود بھی نماز پڑھتے اور اپنے شاگردوں کو بھی پڑھاتے۔ بعض لڑکے یہ کہتے کہ چونکہ شیرانوالہ مسجد قریب ہے ہم تو وہیں نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ میں مولانا احمد علی صاحب کے درسوں اور خطبوں سے مستفید ہوتا رہا، ان کے پیچھے نماز پڑھتا رہا، اور میں نے ان کی مسجد کی جنم کی صفیں بہت گھسائی ہیں۔ اس زمانے میں درس، پند و نصیحت وغیرہ سب کچھ ہوتا تھا، ماحول کافی حد تک دینی اور اسلامی ہوتا تھا۔" (ایضاً)

کالج کے ایام

سکول کی زندگی سے فارغ ہو کر ملک صاحب کالج کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ اس دور میں کالجوں کے اندر انگریزی نظامِ تعلیم پوری قوت کے ساتھ رائج تھا۔ اس نظامِ تعلیم میں مادہ پرستی کا اس حد تک درس دیا جاتا رہا ہے کہ اسلامی عقائد و اخلاق کی جڑیں ہل جاتی تھیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی نظامِ تعلیم سے مسلمانوں کے اندر الحاد و دہریت کو بڑا رواج ملا، اور اس کے نتیجے میں مسلمان نوجوانوں کے اندر طرح طرح کے غیر اسلامی افکار و نظریات در آنے لگے۔ ادب، تاریخ، معاشرت، معیشت اور سیاست، غرض ہر میدان میں فکری انتشار نے جنم لیا۔ یہاں بھی ملک صاحب اللہ تعالیٰ کی عنایت خاص سے بہرہ مند رہے، اور انھیں ایسے اساتذہ کا سایہ حاصل رہا جو انھیں خوب سے خوب تر بننے میں مدد دیتے رہے۔ ملک صاحب نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں انھیں جو اساتذہ ملے ان میں ایک مولانا علم الدین سالک مرحوم تھے، جن سے ملک صاحب نے فارسی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی۔ سالک مرحوم کی دیندارانہ طبیعت کے بارے میں ملک صاحب فرماتے ہیں: "یہ ناممکن تھا کہ ان کی کلاس میں کوئی شاگرد ننگے سر بیٹھے۔ ہر طالب علم ٹوپی لے کر آتا تھا، دوسرے پیریڈوں میں دا ب رکھتا یا کہیں رکھ دیتا، لیکن فارسی کے پیریڈ میں اسے لازماً ٹوپی پہننا ہوتی تھی۔ اگر قمیص کا کوئی بٹن کھلا ہوتا تو وہ اعتراض کرتے اور کہتے بٹن بند کرو، اور اگر کسی کا سر ننگا ہوتا تو وہ پوچھتے "تمھارا نام کیا ہے؟" اگر جواب میں کوئی کہتا، "جی میرا نام غلام علی ہے یا غلام محمد، تو فرماتے: "نہیں نہیں، تمھارا بپتسمہ کس گرجے میں ہوا ہے؟ تمھارا مسیحی نام کیا ہے؟" (ایضاً)

اس طریق تربیت پر آج کل کے ماہرین نفسیات طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمان نوجوانوں کی تربیت جس طرح اصلاحِ باطن کے لیے ضروری ہے، اسی طرح اصلاحِ ظاہر کے لیے بھی ضروری ہے۔ ظاہری اصلاح کا اثر باطن پر بھی پڑتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا علم الدین سالک مرحوم کے علاوہ ملک صاحب کو کالج کی زندگی میں دوسرے بھی قابلِ قدر اساتذہ ملے، جنھوں نے ان کی فطری صلاحیت، دینی ذوق اور جستجوئے حق کے محرکات کو دبانے کے بجائے مزید اجاگر کیا۔ اور پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی کالج میں مولانا مودودیؒ کچھ عرصہ کے لیے پہنچ گئے اور ملک صاحب کا ان سے رابطہ ہو گیا۔

میرے نزدیک حالات و واقعات کا یہ تسلسل اتفاقات کی قبیل سے نہیں ہے، بلکہ جستجوئے حق رکھنے والے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہِ حق آسان کرنے کے لیے جو "توفیق" دی جاتی ہے وہی ان تمام واقعات کے پیچھے کار فرما ہے۔

مولانا مودودیؒ کی شاگردی میں

مولانا مودودیؒ کی اسلامیہ کالج سے وابستگی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ملک صاحب فرماتے ہیں:

"ہمیں معلوم ہوا کہ مولانا مودودیؒ صاحب اب دینیات پڑھایا کریں گے۔ مولانا سے پہلے ٹونک کے مولانا عمر خان ہمیں دینیات پڑھاتے تھے۔ بڑے نیک اور بااصول آدمی تھے۔ وہ ضعیف ہو چکے تھے اور ان کی جگہ مولانا مودودیؒ تشریف لائے۔ مولانا سے جب انجمن کے حکام نے بات چیت کی تو مولانا نے فرمایا: "میں اعزازی طور پر کام کروں گا، کوئی معاوضہ نہ لوں گا۔ میرے کام میں، طرزِ تعلیم میں آپ کسی قسم کی مداخلت نہیں کریں گے، کوئی قدغن نہ لگائیں گے، کوئی خاص گائیڈ لائنز (رہنما اصول) نہ دیں گے۔ میں خود ایک معروف آدمی ہوں، لیکن بہرحال آپ نے پیش کش کی ہے، میں اس سے فائدہ اٹھاؤں گا، اور یوں نوجوان تعلیم یافتہ نسل تک میری آواز پہنچ جائے گی۔" (ایضاً)

اس مشروط معاہدے کے بعد، مولانا مودودیؒ نے اسلامیہ کالج میں اسلامیات کا مضمون پڑھانا شروع کر دیا۔ مولانا کے پاس وقت کم ہوتا تھا اور ہر کلاس میں جا کر لیکچر دینا مشکل تھا۔ اس لیے ان کے مشورے کے مطابق تمام طلبہ کو ایک ہال میں جمع کر لیا جاتا، اور وہ بیک وقت سب کو لیکچر دیتے۔ ملک صاحب فرماتے ہیں: "یہاں مولانا کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ اس وقت ان کے بال بالکل سیاہ تھے۔ ٹوپی کالی پہنتے تھے، کبھی کبھی روی ٹوپی بھی پہنے ہوتے تھے۔"

مولانا اپنے لیکچروں میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کی تشریح کرتے، اور بتاتے کہ اسلام محض پوجا پاٹ کا یا فقط عبادات کا دین نہیں ہے، بلکہ یہ عبادات تو دراصل ہمیں ایک بڑی عبادت کے لیے تیار کرتی ہیں، اور یہ عبادت پوری زندگی پر محیط ہے۔ اسلام کا ایک وسیع اور ہمہ گیر اجتماعی نظام ہے، جو زندگی کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں سیاست بھی ہے، معیشت بھی، معاشرت بھی، غرض ہر چیز اس کے دائرے میں آتی ہے، سیاست بھی اس سے خارج نہیں ہے۔

مولانا کے اس اندازِ تعلیم اور تشریحِ دین سے کالج کے اربابِ اختیار کچھ پریشان ہوئے۔ یہ تشریح انسان کو انسان کی غلامی سے نجات حاصل کرنے، اور طاغوتی نظام کو پاش پاش کر کے دنیا کے اندر دینِ حق کو غالب کرنے کی دعوت تھی۔ اس دعوت نے ہر دور میں اربابِ اختیار و اقتدار کو پریشان کیا ہے۔ جس زمانے میں مولانا اسلامیہ کالج کے اندر دین کی یہ تشریح نوجوان نسل کے سامنے کر رہے تھے، وہ انگریزوں کا دور تھا، اور انگریز حکمرانوں سے کالج کو گرانٹ ملتی تھی۔ اس لیے انجمن کے اربابِ اختیار نے محسوس کیا کہ مولانا کا طرزِ تعلیم انھیں مہنگا پڑے گا۔ انھوں نے مولانا کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ "دینیات" تک اپنے کام کو محدود رکھیں۔ مولانا محترم کو یہ حدود و قیود پسند نہ تھیں۔ انھوں نے جب یہ محسوس کیا کہ ان کی تقریروں سے یہ لوگ خدشات میں مبتلا ہو گئے ہیں تو انھوں نے خود ہی بڑھ کر اس سلسلے کو ختم کر دیا۔

مولانا مودودیؒ سے وابستگی

ملک صاحب کا رابطہ مولانا مودودیؒ سے قائم ہو چکا تھا، بلکہ ملک صاحب کے بقول: "مولانا کی ایک آدھ تقریر سن کر ہم تو دل ہی دے بیٹھے۔"

مولانا نے جب کالج چھوڑ دیا، تو ملک صاحب نے بھی تعلیم بیچ میں چھوڑ دی، اور مولانا کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔ یہ وابستگی جذباتی و اندھی عقیدت پر مبنی نہ تھی، بلکہ ملک صاحب نے شعوری طور پر مولانا کے پیغام کو سمجھا، ان سے بحثیں کیں، اور پھر پورے شرحِ صدر و طمانیتِ قلب کے ساتھ مولانا کے شریکِ سفر ہو گئے۔ ملک صاحب کے بعض اساتذہ نے انھیں اس اقدام سے اپنی صوابدید کے مطابق روکنے کی کوشش کی، مگر ملک صاحب دل اور شعور دونوں کے ہاتھوں جو فیصلہ کر چکے تھے، وہ اٹل تھا، اور مشیتِ الٰہی اس کے پیچھے کار فرما تھی۔

تعلیم کا سلسلہ ختم کرنے کے بعد ملک صاحب نے اقامتِ دین کو زندگی کا مقصد بنا لیا۔ ان کی زندگی میں یہ ایک ایسا بنیادی انقلاب تھا جسے سرسری سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک نوجوان طالب علم، جو اپنے والدین کی ہزاروں تمناؤں کا مرکز ہو اور جسے خود بھی دنیاوی لحاظ سے اپنے روشن مستقبل کی کرنیں نظر آ رہی ہوں، اگر کوئی ایسا فیصلہ کرتا ہے کہ اس سے نہ والدین کی آرزوئیں بروئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کار آئیں اور نہ ذاتی امنگوں کی تکمیل کی گنجایش رہے، تو یہ فیصلہ یقیناً کسی بالاتر ایمانی قوت کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقامتِ دین کے اعلیٰ و ارفع نصب العین کو سمجھ کر ملک صاحب مولانا کی خدمت میں آئے، اور کہنے لگے: "میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ مسلمان کے کرنے کا یہی کام ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بہرحال مسلمان کو کسی ایسے کام کا مکلف نہیں ٹھہرایا جو ناممکن العمل ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اسے منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں یا نہیں۔"

اس کے جواب میں مولانا نے بھی اس جوہر قابل کے سامنے اس موقع پر جن خیالات کا اظہار کیا، وہ ان کی داعیانہ شان کا نہایت اہم گوشہ وا کرتا ہے: "بہرحال مسلمان کے کرنے کا یہی کام ہے۔ بطور مسلمان انفرادی حیثیت سے اور اجتماعی حیثیت سے ہمارے ذمے یہی کام ہے کہ ہم دنیا کے اندر اسلام کی دعوت کو پھیلائیں اور دین کی اقامت کریں، خواہ کامیابی حاصل ہو یا نہ ہو۔ نتائج تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ بہت سے انبیا گزرے ہیں کہ کسی کو ایک مقتدی ملا، کسی کو دو۔ قیامت کے روز بعض انبیا تشریف لائیں گے تو انکے ساتھ ایک ایک، دو دو، ساتھی ہوں گے۔ بعض کے تو گھر والوں نے بھی ساتھ نہ دیا۔ اس لیے اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ خدا کے فضل سے کروڑوں مسلمان موجود ہیں، اگر وہ چاہیں تو کیوں انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔"

مولانا مرحوم کے اس پُرسوز اور جذبہ انگیز جواب کے بعد ملک صاحب نے اپنے جس ردِّ عمل کا اظہار کیا وہ بھی کیا خوب ہے۔ ملک صاحب نے کہا: "ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم، میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ میں نوجوان ہوں، میری کوئی زیادہ دینی تعلیم بھی نہیں، ویسے میں بالکل ہی کورا بھی نہیں ہوں۔ بہرحال میں آپ کے ساتھ ہوں، میں اپنی زندگی کو اس مقصد کے لیے وقف کرنے کا عہد کرتا ہوں"۔ (ایضاً)۔

ثابت قدمی و استقامت

اس انقلابی فیصلے کے بعد ملک صاحب نے تعلیم کو ادھورا چھوڑ دیا۔ جیسا کہ پیچھے عرض کر آیا ہوں کہ ملک صاحب نے جب تعلیم کو ادھورا چھوڑ دیا، تو ان کے نہایت قابلِ قدر اساتذہ نے انھیں بہت سمجھایا کہ یہ ایک جذباتی فیصلہ ہے، تعلیم کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچانا دانش مندانہ اقدام نہیں ہے۔ مگر ملک صاحب اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے، اور ان دانشوروں کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ ملک صاحب نے جذبات کی رَو میں بہہ کر یہ کام کیا تھا۔ ملک صاحب کا یہ فیصلہ پورے شعور پر مبنی تھا، اور مستقبل نے بتا دیا کہ

© rasailojaraid.com